**Journal of Religion & Society (JR&S)**
*Available Online:*
*https://islamicreligious.com/index.php/Journal/index*
*Print ISSN: 3006-1296Online ISSN: 3006-130X*
*Platform & Workflow by: Open Journal Systems*

# Greater Israel: Aspirations and Potential Threats to the Muslim World, A Critical Research Study

# گریٹر اسرائیل:خواب اور مسلم دنیا کے ممکنہ خطرات،ایک تنقیدی تحقیقی مطالعہ

**Shahana Nazli**
MS Islamic Studies Scholar, Department of Islamic Studies, HITEC University Taxila, Pakistan
nazlishahana7@gmail.com

## Abstract

*The concept of "Greater Israel" (Eretz Yisrael HaShlema) has long been a subject of religious, political, and geopolitical discourse, rooted in certain interpretations of Biblical scriptures and Zionist ideology. This paper seeks to critically examine the historical origins, ideological foundations, and political manifestations of the Greater Israel vision, while assessing its implications and perceived threats for the Muslim world. The research explores how this vision has influenced Israeli expansionist policies, settlement strategies, and regional alliances, particularly in the context of the occupied Palestinian territories and neighboring Arab states. By tracing the evolution of this idea from ancient religious texts to modern political rhetoric, the study reveals how religious myth is often used to justify geopolitical ambition. It further investigates how the narrative of Greater Israel poses challenges to regional stability, fuels sectarian tension, and contributes to the marginalization of Palestinian rights. The paper also analyzes the response of Muslim-majority countries, ranging from diplomatic opposition to passive normalization and assesses the broader consequences of this ideological project on the future of the Middle East. Through qualitative analysis and review of historical and contemporary sources, this article provides an in-depth understanding of the symbolic and strategic dimensions of the Greater Israel doctrine. It argues that ignoring this ideological agenda could result in the erosion of Muslim unity and strategic autonomy in the region, thereby necessitating a coordinated intellectual, diplomatic, and geopolitical response.*

***Keywords:*** *Greater Israel, Zionism, Middle East, Muslim World, Palestine, Geopolitics, Settler Colonialism, Israeli Expansionism, Arab-Israeli Conflict, Religious Nationalism.*

## تعارف:

گریٹر اسرائیل کا تصور محض ایک جغرافیائی منصوبہ نہیں بلکہ ایک گہرا مذہبی، سیاسی اور نظریاتی حکمت عملی ہے جو صہیونی تحریک کے بنیادی اہداف میں شامل ہے۔ یہ منصوبہ تورات اور تلمود میں مذکور "ارضِ موعود" (وعدہ کی گئی سرزمین) کے تصور سے ماخوذ ہے، جسے جدید صہیونی ریاست اسرائیل اپنی پالیسیوں میں واضح طور پر جھلکاتی ہے۔ تاریخی طور پر، یہ مذہبی بیانیہ یہودیوں کے لیے ایک قومی وطن کے قیام کے سیاسی مقصد میں ڈھالا گیا، جس کا مقصد یورپ میں یہود دشمنی کا مقابلہ کرنا تھا۔ آج، اس نظریے کا مقصد دریائے نیل سے لے کر دریائے فرات تک کے وسیع علاقے پر اسرائیلی بالادستی قائم کرنا ہے، جس میں موجودہ اسرائیل کے علاوہ فلسطین، گولان کی پہاڑیاں، لبنان کے کچھ حصے، اردن کا بڑا حصہ اور سینا بھی شامل ہیں۔ یہ توسیع پسندانہ عزائم نہ صرف مسلم دنیا کے لیے سنگین خطرات کا باعث ہیں بلکہ یہ فلسطینیوں کی زمینوں پر قبضے اور ان کے حقوق کی پامالی کا بھی سبب بنتے ہیں۔ یہ صورتحال مشرق وسطیٰ میں گہرے تنازعات اور عدم استحکام کو جنم دیتی ہے، جس کے وسیع تر علاقائی اور

عالمی اثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔ عالمی سطح پر یہ نظریہ بین الاقوامی قوانین کی خلاف ورزی اور سفارتی کشیدگی کا باعث بنتا ہے، اس طرح عالمی سیاست اور امن کے لیے ایک بڑا چیلنج پیش کرتا ہے ۔

یہودیت کی تاریخ

توریت کے ایک باب میں "یہودیت "نامی ایک بہادر یہودی عورت کا ذکر ہے، جو بیوہ ہونے کے بعد زاہدہ بن گئی۔ اس نے اپنی قوم کی رہنمائی کے لیے ایک کتاب اپنی مادری زبان میں لکھی اور دشمن کے سردار الیفانا کو چالاکی سے قتل کرکے یہودیوں کو فتح دلائی۔ اس کتاب کو الہامی بھی کہا گیا ہے،[i] مگر اصل نسخہ موجود نہیں۔ یہودی قوم کو حضرت یعقوب (جنہیں اسرائیل بھی کہا جاتا ہے) کی اولاد بتایا گیا ہے اور ان کے بارہ بیٹوں کی نسبت سے بارہ قبائل قائم ہوئے۔[ii] قرآن نے ان سے نبی آخر الزماں پر ایمان لانے کا وعدہ یاد دلایا، مگر انہوں نے انکار کر دیا۔

" اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس (قرآن) پر ایمان لاؤ جو اللہ نے نازل کیا ہے، تو کہتے ہیں: ہم تو صرف اس پر ایمان لاتے ہیں جو ہم پر نازل ہوا[iii]"…، کیونکہ آپ حضرت اسماعیل کی نسل سے تھے، نہ کہ حضرت اسحاق کی۔ "یہود" کے لفظ کی مختلف وجوہات بیان کی گئی ہیں، جیسے حضرت یعقوب کے بیٹے "یہودا" سے نسبت یا توبہ و دوستی کا مفہوم۔ جب حضرت عیسیٰ تشریف لائے تو ان پر ایمان لانے والے نصاریٰ کہلائے،[iv] کیونکہ انہوں نے مدد کی۔ یہود میسوپوٹیمیا سے آکر کنعان میں آباد ہوئے، قحط کے باعث مصر چلے گئے اور وہاں غلام بنا لیے گئے۔ توریت میں بیان ہوا ہے کہ جب وہ خدا کی اطاعت کرتے رہے، وہ کامیاب ہوئے، مگر جب انہوں نے نافرمانی کی تو ذلت و غلامی ان کا مقدر بنی۔[v] اس قوم کی تاریخ آزمائش، نافرمانی، توبہ اور پھر مدد کے دائرے میں گھومتی ہے، اور یہی سلسلہ جاری رہا یہاں تک کہ وہ دوبارہ اپنے مقدس مقام پر واپس آئے۔

ارض موعود کا تاریخی و مذہبی پس منظر

ارضِ موعود یا Promised Land وہ سرزمین ہے جس کا وعدہ یہودی روایات کے مطابق اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ، ان کے بیٹے حضرت اسحاقؑ اور پوتے حضرت یعقوبؑ (جنہیں اسرائیل بھی کہا جاتا ہے) سے کیا تھا۔

"اس دن خدا نے ابرام سے عہد باندھا اور کہا: میں نے تیری نسل کو مصر کی نہر سے لے کر بڑے دریا، دریائے فرات تک کی زمین عطا کی ہے۔[vi]"

یہ سرزمین کنعان تھی، جو موجودہ فلسطین، اردن، لبنان اور شام کے بعض علاقوں پر مشتمل تھی۔ یہودی اسے مقدس اور خدا کی طرف سے عطا کردہ زمین مانتے ہیں، کیونکہ توریت میں بار بار اس وعدے کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان کے مطابق حضرت موسیٰؑ نے بھی اسی سرزمین کی طرف ہجرت کی، لیکن ان کی قوم کی نافرمانیوں کے باعث وہ چالیس سال صحرا میں بھٹکتی رہی اور وعدہ پورا نہ ہوا۔[vii] تاریخی طور پر حضرت سلیمانؑ کے دور میں اسرائیلی سلطنت کو سب سے زیادہ وسعت ملی، مگر یہ بھی مکمل "ارض موعود" پر قابض نہ ہو سکی۔ بعد میں یہ سلطنت دو حصوں میں تقسیم ہو گئی، اور دس قبائل نے شرک و بدعملی اختیار کر لی، جس کی وجہ سے خدا کا غضب ان پر نازل ہوا اور وہ غلام بنائے گئے۔ آج بھی یہودی سمجھتے ہیں کہ وہ سرزمین جس کا خدا نے وعدہ کیا تھا، ان کی ہے، اور اسی لیے اسرائیل میں دنیا بھر سے یہودیوں کو لا کر آباد کیا جا رہا ہے۔ مگر قرآن اور تاریخ بتاتی ہے کہ ان کا یہ دعویٰ خدا کے ساتھ کیے گئے اصل عہد کی خلاف ورزی کے باعث درست نہیں ٹھہرتا۔ ارضِ موعود کا تصور یہودی مذہبی اور قومی شناخت میں ایک مرکزی حیثیت رکھتا ہے، جس کی بنیادی جڑیں قدیم متون میں پیوست ہیں۔ تورات، خاص طور پر کتاب پیدائش (باب 15:18) میں، اس تصور کا سب سے واضح بیان ملتا ہے جہاں خدا کی جانب سے حضرت ابراہیمؑ سے ایک وعدہ کیا گیا کہ ان کی نسل کو دریائے نیل سے لے کر دریائے فرات تک کی سرزمین عطا کی جائے گی. یہ نہ صرف ایک جغرافیائی حد بندی ہے بلکہ ایک الٰہی وعدہ ہے جو یہودیوں کے لیے ان کی سرزمین کے حق کو مقدس بناتا ہے۔ جیسے:

"اے میری قوم! اس مقدس زمین میں داخل ہو جاؤ جو اللہ نے تمہارے لیے لکھ دی ہے۔[viii]"

اس کے علاوہ، یہودی مذہبی قوانین اور روایات کا مجموعہ تلمود بھی اس تصور کو مزید تقویت بخشتا ہے، جہاں اس "وعدہ کی گئی سرزمین" کی اہمیت اور اس سے متعلق احکامات و تشریحات بیان کی گئی ہیں۔ یوں، ارضِ موعود کا نظریہ محض ایک جغرافیائی دعویٰ نہیں بلکہ یہ صدیوں سے یہودی مذہبی شناخت اور قومی امنگوں کا بنیادی حصہ رہا ہے۔[ix]

## قیامِ اسرائیل کے بارے میں قرآن کی پیشن گوئیاں

اور ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب میں صاف صاف بتا دیا تھا کہ تم زمین میں دو مرتبہ فساد کرو گے اور بڑی سرکشی دکھاؤ گے۔ پھر جب پہلی بار کا وعدہ آیا، ہم نے تمہارے خلاف اپنے سخت لڑاکا بندے بھیجے، جو شہروں کے اندر گھس گئے، اور یہ وعدہ پورا ہو کر رہا۔ پھر جب پہلی بار کا وعدہ آیا، ہم نے تمہارے خلاف اپنے سخت لڑاکا بندے بھیجے، جو شہروں کے اندر گھس گئے، اور یہ وعدہ پورا ہو کر رہا۔ اگر تم نیکی کرو گے تو اپنے ہی لیے کرو گے، اور اگر برائی کرو گے تو اس کا وبال بھی تم پر ہو گا۔ پھر جب دوسرے وعدے کا وقت آیا، تو ہم نے دوسرے بندے بھیجے تاکہ وہ تمہارے چہرے بگاڑ دیں اور مسجد (بیت المقدس) میں اسی طرح داخل ہوں جیسے پہلی بار داخل ہوئے تھے، اور جس چیز پر وہ قابض ہوں، اسے تباہ کر دیں۔[x]"

قرآن کریم کے اس سورت کے آخر میں اسرئیل کی قطعی اور کھلی زوال اور شکست کا ذکر موجود ہے جس کی بنا پر اس سورت کو سورۃ بنی اسرائیل کہا جاتا ہے۔

دوسری جنگ عظیم (1939–1945ء) تک بنی اسرائیل کی قوم دنیا کے تقریباً 100 سے زائد ممالک میں منتشر تھی۔ یہ وہ حقیقت ہے جسے قرآن مجید نے بھی بیان کیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"وَقَطَّعْنَاهُمْ فِي الْأَرْضِ أُمَمًا"[xi]

"اور ہم نے انہیں روئے زمین میں مختلف گروہوں میں منتشر کر دیا"...

یہ بکھری ہوئی حالت دو ہزار سال تک جاری رہی۔ یہ وہ مدت تھی جس میں یہودی قوم کسی ایک قومی ریاست یا مستقل وطن سے محروم رہی، اور دنیا بھر میں پسماندگی، تنگی اور غلامی کی زندگی بسر کرتی رہی۔ یہی وہ صورتِ حال تھی جس کی طرف علامہ اقبال نے اپنے اشعار میں اشارہ کیا:

"ہے نزع ہی کی حالت میں یہ تہذیب کے جواں مرگ
شاید ہوں کلیسا کے یہودی متولی دا"

ایک اور مقام پر فرمایا:

تری دوا نہ جنیوا میں ہے، نہ لندن میں
فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے[xii]"

اقبال نے یہ اشعار اُس وقت کہے جب اسرائیل کا وجود دنیا کے نقشے پر موجود نہ تھا، لیکن یہودی مغرب میں اپنی معاشی و سیاسی گرفت مضبوط کر رہے تھے۔

آج ہم دیکھتے ہیں کہ "اسرائیل" محض ایک ریاست نہیں بلکہ ایک عالمی اثر و رسوخ رکھنے والی طاقت بن چکا ہے۔ وہ نہ صرف مشرقِ وسطیٰ میں عسکری اور انٹیلیجنس کے اعتبار سے غالب ہے بلکہ عالمی سیاست، معیشت اور میڈیا پر بھی گہرا اثر رکھتا ہے۔

قرآن مجید کی سورۃ بنی اسرائیل (الاسراء) کی میں ایک نہایت اہم پیشن گوئی بیان کی گئی:

وَقُلْنَا مِنْ بَعْدِهِ لِبَنِي إِسْرَائِيلَ اسْكُنُوا الْأَرْضَ، فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ الْآخِرَةِ جِئْنَا بِكُمْ لَفِيفًا"

اور ہم نے اس کے بعد بنی اسرائیل سے کہا کہ تم زمین میں رہائش اختیار کرو، پھر جب آخرت کا وعدہ آ جائے گا تو ہم تم سب کو جمع کریں گے۔"[xiii]

بعض مفسرین نے اس آیت کی تفسیر "یومِ آخرت" یا میدانِ حشر کے سیاق میں کی ہے۔ جیسے امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:

جب قیامت کا دن آئے گا، تو ہم بنی اسرائیل کو مختلف اطراف سے اکٹھا کریں گے۔"[xiv]

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے مطابق بھی اس کا مفہوم یہی ہے کہ یہ اکٹھا ہونا روزِ محشر کا ہے۔ تاہم بعض جدید مفسرین جیسے ڈاکٹر عبد الکریم الخطیب اور شیخ اسعد بیوض تمیمی کے مطابق یہ آیت بنی اسرائیل کی دنیاوی واپسی اور دوبارہ قوم کی شکل میں ابھرنے کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے۔[xv]

سورۃ المائدہ کی آیت 21 میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو حکم دیتے ہیں:

يَا قَوْمِ ادْخُلُوا الْأَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِي كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ"

اے میری قوم! اس مقدس سرزمین میں داخل ہو جاؤ جو اللہ نے تمہارے لیے لکھ دی ہے"۔[xvi]..

یہی وہ سرزمین ہے جسے بنی اسرائیل نے "ارضِ موعود" کے طور پر ہمیشہ یاد رکھا۔ قرآن میں ان کی سرکشی اور نافرمانی کی وجہ سے ان پر آنے والے عذاب، جلاوطنی، اور قومی حکومت کے خاتمے کا بھی ذکر موجود ہے۔ تاہم، ایک دور ایسا بھی آتا ہے جب اللہ تعالیٰ ان پر دوبارہ رحم فرماتا ہے اور انہیں ایک موقع دیتا ہے کہ وہ اصلاح کریں:

اور ہم نے ان پر پھر رحم کیا تاکہ وہ اصلاح کریں، اور اگر وہ پھر سرکشی کریں گے تو ہم انہیں دوبارہ تباہ کر دیں گے۔"[xvii]

ڈاکٹر عبد الکریم الخطیب لکھتے ہیں کہ بنی اسرائیل کی تاریخ مسلسل عروج و زوال، اجتماع و انتشار سے عبارت ہے۔ جب ان کو قوت ملی تو فساد پھیلایا، اور جب اللہ کا غضب نازل ہوا تو دوبارہ منتشر کر دیے گئے۔ ان کے مطابق یہ عمل قیامت تک جاری رہے گا۔[xviii]

اسی طرح مسجد اقصیٰ کے سابق امام، شیخ اسعد بیوض تمیمی لکھتے ہیں کہ سورۃ الاسراء کی مذکورہ آیات اس بات کی غماز ہیں کہ دنیا بھر سے منتشر یہودی فلسطین کی سرزمین میں دوبارہ واپس آ رہے ہیں—یہ گویا قرآنی پیشن گوئی کی تکمیل ہے، تاہم یہ اجتماع اصلاح کا آخری موقع ہے، اس کے بعد اگر انہوں نے سرکشی جاری رکھی تو اللہ کی طرف سے فیصلہ کن عذاب نازل ہو گا۔[xix]

## صہیونی تحریک

صہیونیت (Zionism) ایک سیاسی تحریک ہے جس کا مقصد دنیا بھر کے یہودیوں کو ایک قومی ریاست میں جمع کرنا تھا، جس کا مرکز "ارضِ موعود" یعنی فلسطین ہو[xx]۔ اس تحریک کا آغاز 19ویں صدی کے آخر میں یورپ میں بڑھتے ہوئے یہود مخالف جذبات (Anti-Semitism) کے ردعمل میں ہوا۔

تھیوڈور ہرزل (Theodor Herzl)، جو ایک آسٹریائی یہودی صحافی اور مصنف تھے، نے 1896ء میں اپنی کتاب Der Judenstaat یہودی ریاست (میں اس خیال کا اظہار کیا کہ یہودیوں کو سیاسی اور جغرافیائی طور پر ایک علیحدہ ریاست کی ضرورت ہے۔

1897ء میں، تھیوڈور ہرزل کی قیادت میں پہلی صہیونی کانگریس سوئٹزرلینڈ کے شہر باسل (Basel) میں منعقد ہوئی، جہاں صہیونی تنظیم کی بنیاد رکھی گئی۔ کانگریس نے اعلان کیا کہ:

صہیونیت کا مقصد یہودی قوم کے لیے فلسطین میں ایک قومی وطن قائم کرنا ہے۔"[xxi]

یہ تحریک بعد میں فلسطین میں یہودی آبادکاری، برطانوی حمایت (Balfour Declaration 1917)، اور بالآخر 1948ء میں ریاست اسرائیل کے قیام کی بنیاد بنی۔

## اسرائیل کا قیام

حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں بنی اسرائیل کو ایک عظیم، مستحکم اور بااثر سلطنت نصیب ہوئی جو مشرقی بحیرہ روم کے اطراف میں واقع تھی۔ اس سلطنت کی حدود مشرق میں دریائے فرات (عراق) سے لے کر مغرب میں مصر کی وادی العریش (شمالی سینائی) تک پھیلی ہوئی تھیں۔[xxii] یہ وہ دور تھا جب اسرائیلی قوم کو مکمل امن، عدل، خوشحالی اور دینی اقتدار حاصل تھا، اور سلطنت کا مرکز حضرت سلیمان علیہ السلام کا تعمیر کردہ عظیم ہیکل (Temple) تھا جو عبادت و شریعت کا نشان تھا۔[xxiii]

تاہم یہ پُرامن دور زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا۔ بنی اسرائیل آسمانی احکامات اور شریعت کے پابند نہ رہے۔ وہ آزادیِ نفس اور انکارِ نبوت جیسے سنگین جرائم کے مرتکب ہوئے، جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کا غضب ان پر نازل ہوا۔ اس قوم کی سرکشی اور نافرمانی نے انہیں بخت نصر جیسے بادشاہ کے ہاتھوں عبرتناک شکست سے دوچار کیا۔ ۵٦۷ قبل مسیح میں بخت نصر نے یروشلم پر حملہ کر کے نہ صرف ان کی سلطنت کو ختم کیا بلکہ انہیں وطن سے جلاوطن کر دیا۔

کئی دہائیوں کے بعد اگرچہ وہ واپس لوٹے اور جزوی طور پر ریاست بحال ہوئی، لیکن رومی بادشاہ "ٹائٹس (Titus) "نے 70 عیسوی میں دوبارہ یروشلم کو تباہ کیا، ہیکل سلیمانی کو منہدم کر دیا، اور اسرائیلیوں کو ایک بار پھر پوری دنیا میں منتشر کر دیا۔

1930ء تک بنی اسرائیل کی قوم مختلف ممالک جیسے عرب ریاستیں، یمن، ایران، افغانستان، ہندوستان، اور یورپ میں بکھری ہوئی تھی۔ ان کی سرگرمیاں دنیا کے مختلف حصوں میں جاری رہیں، جن میں ایران، یونان، چین، قسطنطنیہ اور دیگر علاقوں میں سیاسی، تجارتی اور مذہبی طور پر متحرک رہنا شامل تھا۔ ان سب سرگرمیوں کے پیچھے ان کی ایک ہی دیرینہ خواہش تھی: "ارض موعود" یعنی اس سرزمین کی بازیابی جہاں کبھی ان کی سلطنت قائم تھی۔

تورات کے مطابق اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے فرمایا:

میں تجھے اور تیری نسل کو کنعان کا سارا ملک جس میں تو مسافر ہے، ہمیشہ کے لیے عطا کروں گا اور ان کا خدا ہوں۔[xxiv]"

یہی وہ بنیاد ہے جس پر "ارض اسرائیل" کا عقیدہ کھڑا ہے — ایک ایسا تصور جو مذہبی روایت، تاریخی تمثیل اور سیاسی مقصد کے امتزاج سے تشکیل پایا ہے۔

یہودی قوم گزشتہ دو ہزار سالوں سے مسلسل یہ دعا کرتی رہی ہے کہ وہ یروشلم دوبارہ حاصل کرے اور ہیکل سلیمانی کی دوبارہ تعمیر کرے۔ ہر یہودی مذہبی تقریب، دعا، اور بچوں کی تربیت میں یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ فلسطین ہی ان کا "اصل وطن" ہے، اور ان کا مقصد وہاں واپس جا کر بیت المقدس میں اپنے مذہبی مرکز کو از سرِنو تعمیر کرنا ہے۔ اس نظریہ کو نہ تو کبھی چھپایا گیا، نہ اس پر پردہ ڈالا گیا۔ صیہونی تحریک کے بانیوں نے واضح طور پر اعلان کیا کہ وہ نیل سے فرات تک اور جزیرہ نمائے عرب سے شام کی شمالی سرحدوں تک "گریٹر اسرائیل" کے قیام کے خواہاں ہیں، جہاں دنیا بھر کے تمام یہودیوں کو جمع کر کے ایک مرکزی ریاست قائم کی جاسکے۔

## توسیع پسندی

1948ء میں، اقوام متحدہ کی قرارداد 181 کے تحت فلسطین کو دو ریاستوں میں تقسیم کرنے کی تجویز دی گئی، ایک یہودی ریاست اور ایک عرب ریاست۔ یہودیوں نے اس تجویز کو قبول کیا جبکہ فلسطینی اور عرب ممالک نے اسے مسترد کیا۔[xxv] 14 مئی 1948ء کو، اسرائیل نے خود کو ایک

آزاد ریاست کے طور پر قائم کرنے کا اعلان کیا۔ اس کے فوراً بعد عرب-اسرائیل جنگ چھڑ گئی، جس میں اسرائیل نے نہ صرف اپنی متعین کردہ سرحدیں برقرار رکھیں بلکہ مزید فلسطینی علاقوں پر بھی قبضہ کر لیا۔[xxvi]

1967ء کی چھ روزہ جنگ (Six-Day War) اسرائیلی توسیع پسندی کا عملی مظہر تھی۔ اس جنگ میں اسرائیل نے مصر سے غزہ اور صحرائے سینا، اردن سے مشرقی یروشلم اور مغربی کنارہ (West Bank)، اور شام سے گولان کی پہاڑیاں (Golan Heights) قبضے میں لے لیں۔ ان میں سے بیشتر علاقے آج تک متنازع ہیں۔ اس توسیع پسندی کا جواز صہیونی نظریہ فراہم کرتا ہے، جس کے مطابق "ارضِ موعود" کی بازیابی ایک مذہبی اور قومی فریضہ ہے۔ فلسطینیوں کو ان علاقوں سے نکال کر پناہ گزین بنا دیا گیا، اور اسرائیل نے وہاں غیر قانونی بستیاں (settlements) قائم کرنی شروع کر دیں، جسے اقوامِ متحدہ اور عالمی برادری نے بارہا بین الاقوامی قانون کی خلاف ورزی قرار دیا۔[xxvii]

### جدید اسرائیلی پالیسی اور گریٹر اسرائیل

اگرچہ اسرائیل نے کبھی باضابطہ طور پر "گریٹر اسرائیل (Greater Israel) " کو اپنے قومی نقشوں یا ریاستی پالیسی کا حصہ نہیں بنایا، لیکن یہ تصور صہیونی لٹریچر، مذہبی متون، اور کئی اسرائیلی سیاست دانوں کے بیانات میں نمایاں طور پر موجود ہے۔ جس سرزمین کا ذکر ہے:

اس دن خدا نے ابرام سے عہد باندھا اور کہا: میں نے تیری نسل کو مصر کی نہر سے لے کر دریائے فرات تک کی سرزمین عطا کی ہے۔[xxviii]"

یعنی دریائے نیل سے دریائے فرات تک —وہ بعض یہودی حلقوں کے نزدیک "ارضِ موعود (Promised Land) " کہلاتی ہے، جس پر ان کا خدائی حق ہونے کا دعویٰ ہے۔ اگرچہ یہ سرکاری پالیسی کا حصہ نہیں، لیکن دائیں بازو کے مذہبی اور قوم پرست رہنما، خاص طور پر 1967ء کی جنگ کے بعد، مغربی کنارہ (West Bank) اور دیگر متنازع علاقوں پر مستقل اسرائیلی قبضے کے حامی رہے ہیں۔ بن یامین نیتن یاہو جیسے رہنماؤں نے کئی بار ایسی پالیسیوں کی حمایت کی ہے جن سے ایک عملی "گریٹر اسرائیل" کی جھلک ملتی ہے، خاص طور پر فلسطینی ریاست کے قیام کی مخالفت اور غیر قانونی یہودی بستیوں کے پھیلاؤ کی صورت میں۔ اس نظریے کو بنیاد بنا کر کئی مذہبی جماعتیں اور آبادکار تنظیمیں بھی سرگرم عمل ہیں، جیسا کہ "گوش ایمونیم (Gush Emunim) " جنہوں نے اسے ایک دینی فریضہ قرار دیا۔

### ارضی خطرات

گریٹر اسرائیل کے تصور نے مسلم دنیا کو کئی ارضی خطرات سے دوچار کر دیا ہے۔ سب سے بڑا خطرہ فلسطین کے مکمل انضمام کا ہے، جس کا آغاز 1967ء کے بعد مغربی کنارے اور مشرقی یروشلم پر اسرائیلی قبضے اور وہاں وسیع پیمانے پر غیر قانونی یہودی بستیوں کے قیام سے ہو چکا ہے۔ اسی پالیسی کا تسلسل اردن کے وجود کو بھی خطرے میں ڈال رہا ہے، کیونکہ بعض صہیونی حلقے دریائے اردن کے مشرقی کنارے کو بھی "ارضِ موعود" میں شامل سمجھتے ہیں۔ لبنان کی جنوبی سرحدیں بھی اس نظریے سے محفوظ نہیں رہیں، خاص طور پر دریائے لیطانی تک صہیونی دعووں کے تناظر میں، جن کی جھلک اسرائیل کے 1982ء کے لبنان پر حملے میں دیکھی گئی۔ شام سے گولان کی پہاڑیوں پر اسرائیلی قبضہ، جسے 1981ء میں اسرائیل میں ضم کرنے کی کوشش کی گئی، گریٹر اسرائیل کی جغرافیائی وسعت کے دعوے کو مزید واضح کرتا ہے۔ ان تمام توسیع پسندانہ اقدامات نے نہ صرف فلسطین بلکہ اردن، لبنان اور شام جیسے ممالک کے جغرافیائی وجود کو بھی غیر یقینی صورتحال سے دوچار کر دیا ہے۔[xxix]

### مذہبی وثقافتی خطرات

قبلۂ اول یعنی بیت المقدس کی مذہبی حیثیت پر اسرائیل کا دعویٰ، مسلم دنیا کے لیے ایک نہایت سنگین مذہبی خطرہ ہے۔ یہ دعویٰ صرف جغرافیائی نہیں بلکہ عقیدے، تاریخ اور اسلامی شعائر پر براہِ راست حملہ ہے۔ مسجد اقصیٰ، جو مسلمانوں کا پہلا قبلہ اور تیسرا مقدس ترین مقام ہے، اس وقت اسرائیلی افواج کے قبضے میں ہے اور وہاں یہودیوں کے لیے مستقل عبادت کی جگہیں بنانے کی کوششیں جاری ہیں، جو واضح طور پر اس مقدس مقام کی حیثیت تبدیل کرنے کی ایک منظم کوشش ہے۔ ان اقدامات سے مسلمانوں کے دینی جذبات مجروح ہو رہے ہیں، اور فلسطینی مسلمانوں کے لیے عبادت کے بنیادی حقوق بھی محدود کیے جا رہے ہیں۔

دوسری جانب، اسرائیلی میڈیا، ثقافت اور تعلیمی ذرائع کے ذریعے مسلم نوجوانوں میں دینی، قومی اور تاریخی شعور کو مٹانے کی کوشش کی جا رہی ہے، تاکہ ان کی فکری آزادی کو ختم کر کے ایک نئی ذہنی غلامی مسلط کی جا سکے۔ یہ ایک ایسی نظریاتی جنگ ہے جس کا مقصد صرف زمین پر قبضہ نہیں، بلکہ دل و دماغ کو فتح کرنا ہے۔[xxx] مسجد اقصیٰ، جو کہ اسلام کا پہلا قبلہ اور تیسرا مقدس ترین مقام ہے، آج سنگین خطرات سے دوچار ہے۔ صہیونی ریاست کی سرپرستی میں یہودی انتہا پسند گروہ "ہیکل سلیمانی" کی تعمیر کے نام پر مسجد اقصیٰ کی بنیادوں کو کھودنے، اس کی عمارت کو نقصان پہنچانے، اور اس کے اسلامی تشخص کو مٹانے کی منظم کوششوں میں مصروف ہیں۔ آئے روز مسجد اقصیٰ میں نمازیوں کو روکا جاتا ہے، یہودی آبادکار اشتعال انگیز دورے کرتے ہیں، اور اسرائیلی فورسز کی مسلسل موجودگی اس مقدس مقام کی حرمت کو پامال کر رہی ہے، جو مسلم دنیا کے لیے انتہائی تشویشناک ہے[xxxi]

قرآن مجید میں مسجد اقصیٰ کو نہایت محترم اور برکت والی سرزمین قرار دیا گیا ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندے کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ لے گئی، جس کے اردگرد ہم نے برکت رکھی ہے"[xxxii]۔

اگرچہ قرآن کریم میں موجودہ خطرات کا براہِ راست ذکر نہیں، مگر نبی کریم ﷺ کی کئی احادیث میں آخر الزمان کے فتنوں کے تناظر میں بیت المقدس کا تذکرہ موجود ہے۔ حضرت عبد اللہ بن حوالہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"جب بیت المقدس آباد ہو جائے گا، تو مدینہ کی بربادی قریب ہو گی..."[xxxiii]

یہ حدیث اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ بیت المقدس کی موجودہ صورت حال امت مسلمہ کے حالات سے جڑی ہوئی ہے۔ مسجد اقصیٰ صرف فلسطینیوں کا مسئلہ نہیں بلکہ پوری امت مسلمہ کے عقیدے، تاریخ اور اتحاد کی علامت ہے۔ اس کے تحفظ کے لیے علمی، سیاسی اور سفارتی سطح پر فوری اقدامات ناگزیر ہیں۔

### سیاسی وعسکری خطرات

"گریٹر اسرائیل" کا نظریہ صرف ایک جغرافیائی توسیع کا منصوبہ نہیں بلکہ ایک ہمہ گیر فکری، سیاسی اور عسکری سازش ہے، جس کا ہدف صرف فلسطین تک محدود نہیں بلکہ پورے عالم اسلام کو غیر مستحکم کرنا ہے۔ اس منصوبے کے تحت مشرق وسطیٰ کو فرقہ واریت، خانہ جنگی، سیاسی انتشار اور عسکری کمزوری کی دلدل میں دھکیلا جا رہا ہے تاکہ اسرائیل کو خطے میں واحد مضبوط ریاست کے

طور پر قائم رکھا جا سکے۔عراق، شام، لیبیا، لبنان اور یمن جیسے مسلم ممالک میں جاری شورشیں اور خانہ جنگیاں اسی بڑے منصوبے کا حصہ سمجھی جاتی ہیں، جس کے تحت مسلم دنیا کو چھوٹے چھوٹے کمزور ممالک میں تقسیم کرنا مقصود ہے۔[xxxiv]

قرآن کریم میں یہود کی سازشی فطرت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا:

"ہر بار جب وہ فساد برپا کرتے ہیں، تو اللہ اسے مٹا دیتا ہے، اور وہ دوبارہ فساد پھیلانے لگتے ہیں"[xxxv]

اسی طرح ایک حدیث مبارکہ میں بھی مسلمانوں کو باہمی انتشار اور دشمنوں کے غلبے کے خطرے سے خبردار کیا گیا:

"قریب ہے کہ قومیں تم پر ایسے ٹوٹ پڑیں جیسے بھوکے دستر خوان پر ٹوٹتے ہیں..." صحابہ نے عرض کیا: کیا ہم اُس وقت تعداد میں کم ہوں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں، بلکہ تم اُس وقت بہت زیادہ ہو گے، مگر تم سیلاب کے جھاگ کی مانند ہو گے..."[xxxvi]

یہ حدیث واضح کرتی ہے کہ دشمنوں کی کامیابی مسلمانوں کی کم تعداد کی وجہ سے نہیں بلکہ ان کی اندرونی کمزوری، اختلاف اور دین سے دوری کی وجہ سے ممکن ہوتی ہے۔چنانچہ سیاسی بیداری، عسکری خود انحصاری، اور فکری یکجہتی کے بغیر امت مسلمہ "گریٹر اسرائیل" جیسے منصوبوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔یہ وقت کا اہم ترین تقاضا ہے کہ مسلمان محض مذمتی بیانات پر اکتفا نہ کریں بلکہ سفارتی، تعلیمی، میڈیا اور عسکری محاذوں پر مربوط حکمت عملی اپنائیں۔

**اسلامی دنیا کا ردِ عمل اور ممکنہ حکمت عملی**

گریٹر اسرائیل کے توسیع پسندانہ منصوبے اور مسجد اقصیٰ کو لاحق خطرات کے تناظر میں امت مسلمہ کا ردعمل مجموعی طور پر کمزور، منتشر اور غیر مؤثر رہا ہے۔مسلم ممالک باہمی اختلافات، علاقائی مفادات اور عالمی دباؤ کے باعث اجتماعی حکمت عملی اپنانے سے قاصر نظر آتے ہیں۔جب کہ قرآن مجید میں صراحت سے فرمایا گیا ہے:

"اور اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور تفرقہ مت ڈالو"[xxxvii]

اس آیت کریمہ کی روشنی میں امت کو اتحاد و یکجہتی اپنانے کا حکم دیا گیا ہے، جو آج کے تناظر میں سیاسی، فکری اور عسکری اتحاد کا تقاضا کرتا ہے۔نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

"مؤمن مؤمن کا بھائی ہے؛ وہ نہ اُس پر ظلم کرتا ہے اور نہ اُسے تنہا چھوڑتا ہے"[xxxviii]

یہ حدیث مبارکہ واضح کرتی ہے کہ اگر دنیا کے کسی گوشے میں مسلمانوں پر ظلم ہو رہا ہو تو باقی مسلمان خاموش نہیں رہ سکتے۔چنانچہ امت مسلمہ کو درج ذیل حکمت عملی اپنانی چاہیے:

1. سیاسی سطح پر اتحاد: او آئی سی (OIC) اور عرب لیگ جیسے پلیٹ فارمز کو فعال اور مؤثر بنایا جائے تاکہ مسلم ممالک مشترکہ موقف اختیار کر سکیں۔[xxxix]

2. سفارتی دباؤ: بین الاقوامی سطح پر اسرائیلی مظالم کو بے نقاب کیا جائے، اقوامِ متحدہ اور دیگر عالمی اداروں میں فلسطین کے حق میں مؤثر سفارتی کوششیں کی جائیں۔

3. میڈیا اور تعلیمی محاذ پر بیداری: مسلمان نوجوانوں میں فلسطین اور قبلہ اول سے محبت، دینی غیرت، اور تاریخی شعور اجاگر کیا جائے۔

4. معاشی دباؤ اور بائیکاٹ: ان اداروں اور ممالک کا معاشی بائیکاٹ کیا جائے جو اسرائیل کے ظلم و جبر میں معاون ہیں۔[xl]

5. فکری و دینی اتحاد: فرقہ وارانہ اختلافات کو پسِ پشت ڈال کر قبلہ اول کے تحفظ کو مرکزِ اتحاد بنایا جائے۔

اگر مسلم دنیا ان محاذوں پر سنجیدگی سے عمل کرے تو نہ صرف مسجد اقصیٰ کا تحفظ ممکن ہے بلکہ گریٹر اسرائیل کے منصوبے کو بھی ناکام بنایا جا سکتا ہے۔

## ممکنہ حل

امت مسلمہ کو درپیش سیاسی، عسکری اور نظریاتی خطرات کا حل صرف وقتی بیانات یا مذمتی قراردادوں میں نہیں، بلکہ مستقل، سنجیدہ اور عملی حکمت عملی میں مضمر ہے۔سب سے پہلا اور بنیادی حل امت کا داخلی اتحاد ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

"اور آپس میں جھگڑا نہ کرو، ورنہ تم بزدل ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی"[xli]

دوسرا ممکنہ حل فکری بیداری ہے۔مسلم نوجوانوں کو تاریخ اسلام، فلسطین کی حقیقت، اور یہودی سازشوں سے آگاہ کرنے کے لیے نصاب تعلیم میں ترمیم کی جائے اور میڈیا کے ذریعے شعور بیدار کیا جائے[xlii]

تیسرا اہم حل سفارتی خود مختاری اور عالمی سطح پر مؤثر نمائندگی ہے۔مسلم دنیا کو اقوام متحدہ، آئی سی سی اور دیگر بین الاقوامی اداروں میں منظم لابنگ کے ذریعے فلسطین اور مسجد اقصیٰ کا مقدمہ لڑنا ہوگا، نہ کہ صرف احتجاجی بیانات پر انحصار کرنا[xliii]

چوتھا حل معاشی اتحاد اور اجتماعی بائیکاٹ کی پالیسی ہے، جس کے تحت اسرائیل یا اس کے معاون اداروں کا بائیکاٹ کیا جائے اور مسلم ممالک کے مابین تجارت کو فروغ دیا جائے، جیسا کہ سورہ التوبہ میں ارشاد ہے:

"کافروں کے ساتھ دوستی نہ رکھو، وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں"[xliv]

پانچواں اور اہم ترین حل فلسطینی عوام کی عملی امداد ہے، نہ صرف مالی مدد بلکہ تعلیمی، طبی اور قانونی میدانوں میں بھی مستقل سپورٹ فراہم کی جائے تاکہ وہ اپنی شناخت اور سرزمین کے تحفظ کی جنگ جاری رکھ سکیں۔

اگر یہ تمام اقدامات خلوص نیت اور مستقل مزاجی سے کیے جائیں تو "گریٹر اسرائیل" جیسے شیطانی منصوبے کو سیاسی، فکری اور اخلاقی طور پر شکست دی جا سکتی ہے۔

## نتیجہ(Conclusion)

گریٹر اسرائیل کا منصوبہ محض ایک جغرافیائی خواب نہیں بلکہ ایک مکمل نظریاتی، سیاسی اور عسکری حکمتِ عملی ہے، جو پوری مسلم دنیا کے لیے ایک مسلسل خطرہ بن چکا ہے۔ مسجد اقصیٰ کی حرمت پر حملے، مسلم ممالک میں انتشار، اور فکری یلغار اس منصوبے کے عملی مظاہر ہیں۔ اس صورتحال میں امت مسلمہ کا بیدار ہونا، اتحاد و یگانگت کو اپنانا، اور اجتماعی سطح پر مؤثر اقدامات کرنا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ قرآن و سنت کی روشنی میں یہ واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ اُنہی قوموں کو عزت دیتا ہے جو خود اپنی اصلاح کرتی ہیں۔ چنانچہ اگر امت مسلمہ ایمان، علم، شعور، اور عملی حکمت عملی کو اپنائے تو وہ نہ صرف مسجد اقصیٰ کا تحفظ کر سکتی ہے بلکہ اپنی کھوئی ہوئی عظمت بھی بحال کر سکتی ہے۔

## حوالہ جات(References)

[i] The Book of Judith, in The Apocrypha. Translated by Edgar J. Goodspeed. New York: Vintage Books, 1959.

[ii] تورات، کتاب پیدائش(Genesis)، باب35، آیت22–26۔

[iii] القرآن، سورۃ البقرہ، آیت 91۔

[iv] ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، جلد 1، دارالفکر، بیروت، ص110۔

[v] تورات، کتاب احبار(Leviticus)، باب26، آیات 1–46-

[vi] تورات، کتاب پیدائش، باب15، آیت18۔

[vii] گنتی 33:14–34؛ استثناء35:1–36

[viii] القرآن، سورۃ المائدہ، آیت 21۔

[ix] الطبری، جامع البیان عن تاویل آی القرآن، جلد6، دارالمعرفہ، بیروت، ص233۔

[x] القرآن، سورۃ الاسراء (بنی اسرائیل)، آیات 4–7۔

[xi] سورۃ الاعراف، آیت 168

[xii] اقبال، محمد۔ بانگ درا۔ لاہور: اقبال اکیڈمی پاکستان، 1924۔

[xiii] سورۃ الاسراء، آیت 104

[xiv] امام قرطبی، الجامع لأحکام القرآن، جلد10، دارالکتب العلمیہ، بیروت، ص248۔

[xv] الخطیب، ڈاکٹر عبدالکریم۔ تفسیر القرآن للعصر الحدیث۔ قاہرہ: دار الفکر العربی، 1984۔

[xvi] سورۃ المائدہ کی آیت 21

[xvii] ابن کثیر، اسماعیل بن عمر۔ تفسیر القرآن العظیم، جلد 5، بیروت: دارالفکر، 1999، ص27–28۔ تفسیر سورۃ الاسراء، آیات 6–8

[xviii] الخطیب، ڈاکٹر عبدالکریم۔ تفسیر القرآن للعصر الحدیث۔ قاہرہ: دار الفکر العربی، 1984۔

[xix] تمیمی، شیخ اسعد بیوض۔ بین یدی النکبۃ۔ بیروت: دارالہدیٰ، 1985۔

[xx] Sachar, Howard M. A History of Israel: From the Rise of Zionism to Our Time. New York: Alfred A. Knopf, 2007.

[xxi] Ben-Gurion, David. Israel: A Personal History. New York: Funk & Wagnalls, 1971.

[xxii] تورات، کتاب سموئیل دوم(2 Samuel)، باب5–8؛

[xxiii] تورات، کتاب سلاطین اول(1 Kings)، باب6–8۔

[xxiv] تورات، کتاب پیدائش(Genesis)، باب15، آیت18؛ باب17، آیت8۔

[xxv] Morris, Benny. 1948: A History of the First Arab–Israeli War. Yale University Press, 2008.

[xxvi] Ben-Gurion, David. Israel: A Personal History. New York: Funk & Wagnalls, 1971.

[xxvii] Smith, Charles D. Palestine and the Arab-Israeli Conflict: A History with Documents. Boston: Bedford/St. Martin's, 2016.

[xxviii] The Holy Bible, Genesis 15:18.

[xxix] اوورین، مائیکل بی۔ چھ دنوں کی جنگ: جون 1967ء اور مشرق وسطیٰ کی تشکیل نو . آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، 2002۔

[xxx] صابر، محمود۔ مسجد اقصیٰ: تاریخ، مقام و مسائل .لاہور: ادارہ معارف اسلامی، 2011۔

[xxxi] الیاس خلیل، مسجد اقصیٰ اور یہودی سازشیں، ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد، 2015

[xxxii] سورۃ الاسراء، آیت: 1

[xxxiii] سنن ابی داؤد، حدیث نمبر: 4294

[xxxiv] ڈاکٹر اسرار احمد، گریٹر اسرائیل: یہودی منصوبہ اور مسلم زوال، تنظیم اسلامی، لاہور، 2010

[xxxv] سورۃ المائدہ، آیت 64

[xxxvi] سنن ابی داؤد، حدیث: 4297

[xxxvii] قرآن مجید، سورۃ آل عمران، آیت: 103 (تفسیر ابن کثیر، جلد 1)

[xxxviii] صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ، حدیث نمبر: 2564

[xxxix] ڈاکٹر یوسف القرضاوی، امتِ مسلمہ اور اسرائیلی چیلنج، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، 2012

[xl] مفتی تقی عثمانی، اسلامی دنیا کا مؤثر ردعمل کیا ہونا چاہیے؟، ماہنامہ البلاغ، کراچی، شمارہ اپریل 2021

[xli] قرآن مجید، سورۃ الانفال، آیت: 46

[xlii] ڈاکٹر اکرم ضیاء، اسلامی تعلیم میں فلسطین کا مقام، جامعہ کراچی، 2019

[xliii] یوسف القرضاوی، امت مسلمہ اور اسرائیل: چیلنجز و حل، دار الفتح، قاہرہ، 2015

[xliv] قرآن مجید، سورۃ التوبہ، آیت: 23